(غلام گردش)

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

گوجرانوالہ سے لاہور آتے ہوئے دائیں جانب ایک پرائیویٹ ہسپتال آتا ہے۔کوئی تین چار کلومیٹر باہر۔ایک دن،شدید گرمیوں میں لاہور آرہا تھا۔ہسپتال کی عمارت کے سامنے پہنچا۔دیکھا کہ دس بارہ لوگ سخت دھوپ میں سڑک کے ساتھ ساتھ پودے لگا رہے ہیں۔رُک گیا۔اُتر کر دیکھا تو زاہد ایک دم سامنے نظر آیا۔پوچھا تو انتہائی تہذیب سے بتانے لگا کہ یہ چند نوجوان ساتھی ہیں۔تمام نے فیصلہ کیا ہے کہ شہر میں خالی جگہوں پر پودے لگائینگے۔یہ تمام پودے ہم خود خریدتے ہیں۔زمین میں لگانے کے بعد،لوگوں کو بتاتے ہیں کہ انکی حفاظت کریں اور پانی دیتے رہیں۔یاد ہے۔زاہد نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا۔پسینہ سے شرابور پیلی دھوپ کو کامیابی سے شکست دے رہا تھا۔خیر زاہد کو میں جانتا تھا۔مگر اس دن،اس شخص کا ایک نیا روپ دیکھنے کو ملا۔شائد،میں اس زاہد سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔حیرت زدہ ہو کر واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔لاہور آنے تک یہی سوچتا رہا کہ یہ شخص ایک ایسی سماجی ذمہ داری ادا کر رہا ہے جسکا ادراک صرف بڑے حساس لوگ کر سکتے ہیں۔آج سے ٹھیک بارہ تیرہ برس پہلے کا واقعہ ہے۔اس وقت میں انتظامی طور پر گوجرانوالہ تعینات تھا۔آپکے ذہن میں بھی سوال آیا ہوگا۔بلکہ آنا چاہیے۔کہ زاہد کون ہے۔دراصل یہ ایک عام سا شخص ہے۔مگر ہرگز ہرگز عام نہیں ہے۔ایک نایاب انسان۔مشرقی روایات میں گندھا ہوا شریف آدمی۔جو عنصر اسے حد درجہ منفرد بناتا ہے،وہ یہ کہ سوچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔محسوس کرنے کے کرب میں مبتلا رہتا ہے۔اس بے جان معاشرے کو بہتر بنانے کی دھن میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔دراصل،وہ ایک ایسا فکری قرض واپس کرنے کی تگ ودو میں مصروف رہتا ہے جو اس نے کبھی لیا ہی نہیں۔ہمارے بدصورت سماج کا ایک انتہائی خوبصورت چہرہ۔

بات آئی گئی ہوگئی۔زاہد سے میری ملاقات رہتی تھی۔گوجرنوالہ کی مین سڑک،جو بائی پاس بننے سے پہلے،جی ٹی روڈ ہوتی تھی۔اس پر،تمام بھائیوں نے ملکر اپنے اپنے علیحدہ گھر بنا رکھے ہیں۔زاہد اپنے بھائیوں میں شائد سب سے بڑا ہے۔غور کریں تو اسے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ لوگوں کی بہتری بلکہ سماج کی بہتری کیلئے سوچے اور پھر کام کرے۔بھرپور توانائی اور وقت ضائع کرے۔ایسا کام جسکا ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں۔سیاست سے بھی کوئی لینا دینا نہیں۔لوگوں کے ذہن میں بالکل آتا ہے کہ شائد لوگوں کی بہتری کا کام اسلیے کرتا ہے،کہ اسے سود سمیت واپس سمیٹتا ہے۔مگر سیاست اسکے پاس سے نہیں گزر سکی۔ذاتی منفعت اور نقصان سے بالاتر ہو کر صرف عام لوگوں کے کام آنا۔اپنے شہر کو ہر طور پر بہتر بنانے کی دھن میں لگے رہنا۔یہ ہر عامی کا خاصہ نہیں۔یہ صرف اور صرف دردِ دل رکھنے والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔زاہد اسی قافلے کا مسافر ہے۔دفتر میں تو خیر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ایک دن فون آیا کہ حسن نثار لاہور سے آئے ہوئے ہیں۔میرے گھر قیام پذیر ہیں۔ملاقات ہونی چاہیے۔خیر تھوڑی دیر میں زاہد،حسن نثار کو لیکر دفتر آ گیا۔بتاتا چلوں۔کہ حسن نثار اور میں،دونوں لائل پور کے رہنے والے ہیں۔انہیں بھی فیصل آباد راس نہیں آیا۔اور میں آج تک لائل پور سے ذہنی طور پر باہر نہیں نکل پایا۔لاہور منتقل ہوئے کئی برس گزر گئے۔مگر ابھی بھی پرانے لائل پور کے رومانس سے باہر نہ آسکا۔گمان ہے کہ حسن نثار بھی،اسی فکری بیماری کا اسیر ہے۔زاہد نے

بڑی بے تکلفی سے حسن نثار کا تعارف کروایا۔طویل نشست رہی۔حسن نثار،اپنی طرز کا واحد لکھاری ہے۔جو اس منافق اور بے دردمعاشرے کا اصل چہرہ لوگوں کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کیا کہیں گے۔سود وزیاں کی ہر منزل کو عبور کر چکا ہے۔ملاقات انتہائی پُر مغز رہی۔یہ زاہد کی زندگی کا دوسرا پہلو تھا۔تمام اہل علم سے محبت اور انکے ساتھ مسلسل رابطہ رکھنا۔یہ اسی کا کام ہے۔کوئی ایسا ادیب،دانشور،شاعر یا مفکر نہیں،جو گجرانوالہ آیا ہو اور زاہد نے شہر کی طرف سے بے لوث حقِ مہمانداری نہ ادا کیا ہو۔شدید محبت سے اہل فکر کو اپنے گھر لیجاتا ہے۔اس قدر تواضع کرتا ہے کہ شرمندگی ہوتی ہے۔مگر یہ شرفاء کا وصف ہے جو زاہد میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

عجیب سی بات ہے۔ایک دن کہنے لگا کہ ہمارے شہر میں بہت سے لکھنے والے ہیں۔مگر ضلعی انتظامیہ اور انکے درمیان کوئی ربط نہیں۔دوری سی ہے۔کیوں نہ انہیں سرکٹ ہاؤس میں بلا کر تقریب برپا کی جائے۔جس میں مہمان خصوصی یہی تمام لوگ ہوں۔خیال حد درجہ اعلیٰ تھا۔دس پندرہ دنوں کے اندر سرکٹ ہاؤس میں ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی۔اس میں شہر کے تمام اہلِ ہنر سے باہم ملاقات ہوئی۔یاد ہے کوئی ساٹھ ستر لوگ تھے۔شاعر،ادیب اور ہر طبقے کے سوچنے اور لکھنے والے انسان۔بہت سے مہمان اپنی تصانیف اور دیوان ساتھ لائے تھے۔گفتگو ہوئی تو ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ گجرانوالہ جسکی شہرت کھانوں اور پہلوانوں کے حوالے سے ہے۔اہل قلم سے مزین ہے۔تقریب حد درجہ بھرپور زندگی کے قریب تھی۔ضلعی انتظامیہ کا کام کھردرا سا ہے۔زمینی حقائق کی بدصورتی انسان کے ذہن پر سوار رہتی ہے۔سرکاری کام انسان کو اَز حد خشک سا کر دیتے ہیں۔اس ذہنی خاموشی کو سماجی طور پر زاہد نے اس خوبصورتی سے توڑا،کہ آج تک اس ادبی محفل کا لمس یاد ہے۔بے پناہ تصاویر اور حد درجہ خوشگوار باتیں۔اکثر ادیبوں نے بتایا کہ اس سے پہلے کبھی بھی ضلعی انتظامیہ نے اہل قلم کو اس طرح پذیرائی نہیں دی۔یہ اپنے لحاظ سے ایک پہلی کوشش تھی۔اسکا مکمل سہرا صرف اور صرف زاہد کو جاتا ہے۔اگر وہ اس اچھوتے خیال کا ذکر نہ کرتا تو شائد یہ سلسلہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔مگر زاہد ایسے اَن گنت اچھوتے کام کرتا رہتا ہے۔

ہاں،ایک اور واقعہ ذہن میں آ گیا۔ایک دن شام کو،میں اور زاہد بیٹھے چائے پی رہے تھے۔تو کہنے لگا کہ ہمارے ضلع میں کئی ایسے اہل علم،دانشور ہیں،جو حد درجہ سفید پوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانے کی اجازت انکی اَنا دیتی نہیں ہے۔انکے متعلق سوچنا چاہیے۔اگر ہر ایک کیلئے اگر کوئی وظیفہ مقرر ہو جائے،تو یہ انکی خدمت کا چھوٹا سا اعتراف بھی ہوگا اور ان میں سے چند اصحاب کا بھرم بھی رہ جائیگا۔بات دل کو لگی۔آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر کو بلایا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ اہل ہنر کو دینے کیلئے تو سرکار نے کوئی گرانٹ نہیں دی۔انکو ماہوار پیسے دینا تو ممکن ہی نہیں۔خیر،اسکی اس بات سے مجھے کوئی مایوسی نہیں ہوئی۔اسلیے کہ سرکاری ملازم،معاشرے کی بے پناہ وسعت سے ماورا سا ہو جاتا ہے۔یکساں مصنوعی سوچ کے ساتھ تیس پینتیس برس زندگی گزار کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔خیال اتنا بہتر تھا کہ دل میں خواہش تھی کہ یہ کام ضرور کیا جائے۔آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر سے کہا کہ ایسے لوگوں کی فہرست ترتیب دیں۔جنکو ماہوار کچھ پیسے بھجوائے جاسکیں۔فہرست میں،تخمینہ لگایا تو یہ دو ڈھائی لاکھ ماہوار بنتی تھی۔بارہ برس پہلے کی بات ہے۔کافی بھاری رقم تھی۔خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سرکاری طور پر ہی پیسوں کا انتظام ہو گیا۔اب ہر ماہ تسلسل کے ساتھ چند اہل علم کو وظیفہ جانے

لگا۔ جب سرکاری حلقوں کو معلوم ہوا، تو انہیں کافی تعجب ہوا کہ بھلا، ضلعی انتظامیہ کا اسطرح کے کام کرنے کا کیا جواز ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ٹھیک سوچتے ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ غلط میں بھی نہیں تھا۔ یہ سلسلہ میری ٹرانسفر کے بعد جاری نہ رہ پایا۔ یہ نایاب تجویز بھی زاہد ہی کی تھی۔ کیا ذرخیز ذہن ہے اس شخص کا۔ حیرت ہوتی ہے۔ مگر از حد خوشگوار حیرت۔

یہ سب کچھ لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اسکی وجہ صرف اور صرف ایک ہے۔ تمام دن، ہر لمحہ بری سے بری ترین خبروں سے ہمارے اعصاب کو شل کیا جاتا ہے۔ ہر وقت اپنے ملک کی منفی سے منفی بات سننے میں آتی ہے۔ آپ ٹی وی نہ بھی دیکھیں۔ پھر بھی خراب قسم کی باتیں بھرپور طریقے سے پیچھا کرتی ہیں۔ کبھی کوئی جہاز گر جاتا ہے اور تمام مسافر، اپنی کسی بھی غلطی کے بغیر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ کبھی ٹڈی دل کا لشکر وارد ہوجاتا ہے۔ جسے بھگانا ملکی وسائل میں ناممکن نظر آتا ہے۔ اکثر اوقات ملک کے اکابرین بھرے چوک میں ایک دوسرے کے کپڑے اُتارتے نظر آتے ہیں۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کوئی بھی انسان یا ادارہ الزامات سے مبرا نہیں۔ ٹی وی دیکھ لیں تو خاتون سیاستدان تک، انتہائی رکیک زبان استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ ہر بڑے سیاستدان کے ساتھ اتنے زیادہ پیسوں کے ادنیٰ سکینڈل ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ انہیں پیسہ کمانے کی بیماری سے کیا فیض مل پائیگا۔ کفن میں تو کوئی جیب نہیں رکھی جاتی۔ فرشتے بالکل نہیں پوچھتے کہ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہیں۔ عرض یہ کہ ہر طرف ایک بے سکونی اور افراتفری کا دور دورہ ہے۔ اس میں زاہد اور اسطرح کے لوگ ٹھنڈی چھاؤں والے درخت ہیں جو پورے معاشرے کو سایہ فراہم کرتے ہیں۔ اس قبیل کے تمام لوگ اپنے اوپر ہر سختی برداشت کرتے ہیں۔ مگر سماج کو بھرپور انداز سے زندہ رکھتے ہیں۔ ذاتی صدموں سے روح کو گھائل کر لیتے ہیں۔ مگر لوگوں کی خدمت سے ہرگز ہرگز گریز نہیں کرتے۔ ہمارے جیسے بے سمت معاشروں میں زاہد اور اس طرز کے لوگ، دراصل توازن قائم کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی سے بالاتر ہو کر صرف لوگوں کو پیار کرتے ہیں۔ انکا دکھ بانٹتے ہیں۔ اپنے دکھ کا کبھی بھی کسی سے ذکر نہیں کرتے۔ اس طرح کے خوشبودار لوگ کثرت میں ہونے چاہییں۔ مگر نہیں ہیں۔ جو ہیں، انہی پر اکتفا کرنا ضروری ہے۔ لازم ہے کہ یہی بڑے لوگ، ہمارے جیسے بے روح معاشروں کو زندگی کی حرارت پہنچاتے ہیں۔ ان نایاب لوگوں کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے۔ یہی زندگی کا حسن ہے۔ صاحب! یہی حسن ہے!

راؤ منظر حیات